ترتیب

تقدیم طبعِ اوّل . صفحہ ۴

تقدیم طبع چہارم . . . صفحہ ۵

★ مقالۂ اُولیٰ ★

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت

● تمہید ---------- صفحہ ۹

● بعثتِ انبیاء کا اساسی مقصد ---- " ۱۰

● بعثتِ محمدیؐ کی اتمامی و تکمیلی شان -- " ۲۶

★ مقالۂ ثانیہ ★

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

صفحہ . . . ۵۲

© rasailojaraid.com

تقدیم طبعِ اوّل

زیرِ نظر کتابچہ میرے دو مقالوں پر مشتمل ہے :۔

پہلا مقالہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت : قرآن حکیم کی روشنی میں" مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی دوسری سالانہ قرآن کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں پیش کیا گیا تھا جو جناح (ٹاؤن) ہال لاہور میں ۲۶ مارچ ۷۵ء کی صبح کو منعقد ہوا جس اتفاق سے اس روز ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۵ھ کی تاریخ تھی اور اس طرح مقالے کے موضوع کے ساتھ ایک حسین مناسبت پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں یہ مقالہ دو قسطوں میں ماہنامہ 'میثاق' لاہور کی اکتوبر اور دسمبر ۷۵ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا۔

دوسرا مقالہ "انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج" تحریری صورت میں تو مارچ ۷۷ء میں 'شامِ ہمدرد' لاہور کی تقریب میں پیش کیا گیا تھا اور حسنِ اتفاق سے اس روز بھی قمری تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۷ھ ہی تھی۔ البتہ اس عنوان سے ایک تقریر اوّلاً انجمن خدّام القرآن کی تیسری سالانہ قرآن کانفرنس کے آخری اجلاس ہی میں کی گئی تھی جو ۲۳ مارچ ۷۶ء کی شام کو جناح ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ بعد ازاں ایک جانب تو یہ مقالہ ماہنامہ 'میثاق' لاہور کی اشاعت بابت اپریل ۷۷ء میں شائع ہوا اور دوسری جانب اسے ایک صاحبِ خیر نے چھ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کے مفت تقسیم کیا ——— اب یہ دونوں تحریریں یکجا پیشِ خدمت ہیں!

اللہ تعالیٰ اسے میرے حق میں بھی توشۂ آخرت بنائے اور اس کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی عالمی سطح پر تکمیل کے لیے زندگیاں وقف کر دینے کی وہ "آرزو" پیدا فرمائے جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے بصد حسرت و یاس فرمایا تھا کہ : ع

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں   اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

اس لیے کہ آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل کے لیے جان و مال کھپانا ہی آپؐ کے ساتھ "وفاداری" ہے اور یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا علامہ مرحوم نے کہ :

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں   یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لاہور، ۷ار اپریل ۷۸ء ——— خاکسار : اسرار احمد عفی عنہ

.com

تقدیمِ طبعِ چہارم

اَلحمدُ لِلّٰہ کہ اس کتابچے کی چوتھی طباعت کے موقع پر نظرِ ثانی کی فرصت بھی میسّر آگئی، اور کتابت بھی از سرِ نو کرالی گئی ——— گویا اب یہ کتابچہ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبارات سے پہلے سے بہتر صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

نظرِ ثانی کے دَوران بار بار قلب کی گہرائیوں سے اللہ تعالےٰ کے لیے تشکّر و امتنان کے جذبات پوری شدّت کے ساتھ اُبھرے کہ اُس تعؑ نے محض اپنے فضل وکرم سے اب سے بارہ تیرہ سال قبل مجھ ایسے کم علم اور بے بضاعت انسان کے قلم سے یہ دُوؔ مقالے تحریر کرا دیئے، جو نہ صرف یہ کہ سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے صحیح فہم کے لیے بمنزلۂ کلید ہیں، اس لیے کہ ان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دنیوی کی جدّوجہد کا اصل ہدف بھی معیّن ہوجاتا ہے اور آپؐ کا اساسی منہجِ عمل بھی واضح ہوجاتا ہے ——— بلکہ ان تمام تحریکوں کی اہم ترین اور انتہائی اساسی عملی ضرورت کو بھی پُورا کرتے ہیں جو مختلف مسلمان ممالک میں احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کے عظیم مقصد کے لیے جدّوجہد کر رہی ہیں ——— یعنی اوّلاً : اس امر کا واضح تعیّن کہ احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کی جدّوجہد اسلام کے نظامِ فکر و عمل میں کس مرتبہ ومقام کی حامل ہے ؟ اور توحید، معاد اور رسالت کے اساسی نظریات و معتقدات کے ساتھ اِس کا علمی اور نظری ربط کیا ہے ؟ اور ثانیاً ——— اس امر کی وضاحت کہ اس عظیم جدّوجہد کا نقطۂ آغاز کیا ہے ؟ اور اسلامی انقلاب کے مرحلۂ اوّل یعنی مردانِ کار کی تیاری کے لیے دعوت، تزکیہ، اور تعلیم کا قرآنی اور نبویؐ منہاج کیا ہے ؟ -

راقم الحروف کے واقفانِ حال اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انجمن خدّام القرآن، اور تنظیم اسلامی کی اکثر وبیشتر مطبوعات راقم کی ان تقاریر یا دروس پر مشتمل ہیں جنہیں

© rasailojaraid.c

رفقاء و احباب (بالخصوص رفیق محترم شیخ جمیل الرحمن صاحب) نے ٹیپ سے اتار کر اپنے اپنے ذوق اور فہم کی مناسبت سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے ـــــــ اور گزشتہ بائیس سال کے عرصے میں براہِ راست راقم کے قلم سے نکلنے والی تحریروں کی تعداد بہت کم ہے ـــــــ اس قدرِ قلیل میں یہ دو مقالے دین کے جوہر کی تصور کی وضاحت اور تحریکِ اسلامی کی علمی و فکری اساس کی تعیین کے اعتبار سے سرفہرست ہیں۔ (اور شاید یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، راقم کے معمول اور عادت کے بالکل برعکس، اپنے خصوصی فضل و کرم سے ان پر پورے اہتمام کے ساتھ نظرِ ثانی کی ہمت اور فرصت بھی عطا فرما دی۔ فللہ الحمد!)۔

ان میں سے مقالۂ اوّل یعنی "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت" دو ابواب میں منقسم ہو گیا ہے، یعنی "بعثتِ انبیاءؑ کا اساسی مقصد" اور "بعثتِ محمدیؐ کی اتمامی اور تکمیلی شان" ان میں سے پہلا باب چونکہ فلسفہ و حکمتِ دین کے بعض غامض اور دقیق مباحث پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ایک عام قاری اسے قدرے مشکل اور ثقیل محسوس کرے گا، لیکن اگر ذرا ہمت و محنت سے اس کے صُغریٰ و کُبریٰ کو ذہن نشین کر لیا جائے تو ان شاء اللہ العزیز کارکنوں کی دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں میں کسی نہ کسی درجہ میں "عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ"[1] کا عکس پیدا ہو جائے گا! ـــــــ رہا دوسرا باب، تو وہ تو احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کی جدوجہد میں مصروف و مشغول ہر صاحبِ فہم و شعور انسان کے لیے "لابدّ منہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے صحیح فہم و ادراک کے بغیر نہ صرف یہ کہ اُس کی بھاگ دوڑ اور سعی و جہد ع "آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!" کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ (اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِکَ) ـــــــ بلکہ اس کا بھی شدید خطرہ موجود رہتا ہے کہ انسان اپنی کم ہمتی اور قوتِ ارادی

---

[1] سورہ یوسف: آیت ۱۰۸ ترجمہ: "پوری بصیرت کے ساتھ میں خود بھی اور وہ بھی جو میری پیروی کر رہے ہیں۔"

کے ضعف کے باعث، یا ذرا سی بد دلی اور مایوسی یا اپنی کوشش اور محنت کے حسبِ منشا نتائج برآمد نہ ہوتے دیکھ کر سعی و جہد ہی سے دستکش ہو جائے اور اپنی بے عملی اور تعطّل کے لیے علم اور تحقیق کے نام کو بٹّہ لگاتے ہوئے کسی اُلٹی سیدھی دلیل کا سہارا لے لے ——— اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ "هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ" پر جو جامع اور مدلّل تحریر راقم کے قلم سے آج سے تیرہ سال قبل صادر ہو گئی تھی، میں اسے سراسر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر اور ایک خاص وقت کی کیفیات اور خصوصی جذبے کا مرہونِ منّت سمجھتا ہوں ——— اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اسے نہ صرف ان لوگوں کے حق میں سرمۂ چشم بنا دے جو اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا رشتہ رکھنے کے باوجود تا حال دین کے حَرَکی تصوّر سے ناآشنا ہیں اور محض جامد مذہبیت پر تکیہ کیے ہوئے ہیں، بلکہ اُن بہت سے پُرانے راہروانِ راہِ حق کو بھی اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کا ذریعہ بنا دے جو کسی شخص یا جماعت کے طرزِ عمل سے دل برداشتہ ہونے کے باعث اقامتِ دین کی جدوجہد ہی سے کنارہ کش ہو گئے ہیں، اور اب مختلف گوشہ ہائے عافیت میں پناہ لیے ہوئے ہیں، تاکہ یہ "بھٹکے ہوئے راہی" بھی دوبارہ "سوئے حرم" گامزن ہو جائیں[1] ——— وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ!

مقالۂ ثانی یعنی "انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج" توجّہ کو اسلامی انقلاب کے مرحلۂ اوّل پر مرتکز کر کے اِس اندیشے کا سدّ باب کرتا ہے کہ کوئی طاقتور جذبۂ عمل، انسان کی اُس طبعی کمزوری کی بنا پر جو "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ"[2] میں بیان ہوئی ہے، بنیادی استحکام اور ابتدائی لوازم (PRE-REQUISITES) کو نظر انداز کر کے اپنی تیز روی اور عجلت پسندی کے باعث

۱؎ "بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل۔ اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے!" اقبالؔ

۲؎ سورۃ الانبیاء: ۳۷۔ ترجمہ "انسان کی خلقت میں عجلت پسندی شامل ہے۔"

© rasailojaraid.c

اپنے آپ کو خود ہی ناکامی کا مستحق نہ بنا لے ——— موضوع اور عنوان کی مناسبت سے ظاہر ہے کہ اس مقالے میں انقلاب نبوی کے بقیہ مراحل پر گفتگو خارج از بحث تھی لیکن الحمدللہ کہ اب ان جملہ مراحل پر راقم کی جامع تالیف "منہج انقلابِ نبوی" منصۂ شہود پر آ چکی ہے جس سے اسلامی انقلاب کے تمام مراحل از ابتدا تا انتہا واضح اور مبرہن ہو گئے ہیں ——— فللّٰہِ الحمدُ والمِنّۃ

جن حضرات کو اس کتابچے کے مطالعے سے کوئی رہنمائی میسّر آئے، اُن سے استدعا ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس راہ پر ثبات اور استقامت عطا فرمائے جس کی نشاندہی اس کتابچے میں کی گئی ہے ——— اِدھر میں ان کے حق میں دُعا کرتا رہوں گا کہ علامہ اقبال کے اِس شعر کے مصداق کہ ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تُو نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر!

اگر اللہ نے انہیں اس راہ کی صداقت اور حقانیت پر ذہنی اطمینان اور قلبی انشراح عطا فرما دیا ہے تو اس پر عملاً گامزن ہونے کی ہمت اور توفیق بھی عطا فرمائے۔ واللہ الموفق والمستعان!

اس کتابچے پر نظر ثانی کے سلسلے میں جو تعاون قرآن اکیڈمی کے بزرگ استاد محترم حافظ احمد یار صاحب نے فرمایا اور جن مفید مشوروں سے نوازا، اُن کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر پیشکش کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے دین حق کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد کے سلسلے کی ایک مفید کڑی اور میرے حق میں توشۂ آخرت بنا دے۔ آمین

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

۲۴ جولائی ۱۹۸۸ء ——— ۹ ذی الحج ۱۴۰۸ھ

نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم

کا مقصدِ بعثت

قرآن حکیم کی روشنی میں

★

تمہید

ہمارا ایمان ہے کہ سیّد وُلدِ آدم حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک نبی ہی نہیں "خاتَمُ النبیّٖن" ہیں اور صرف ایک رسُول ہی نہیں "آخِرُ الرُّسُل" ہیں اور آپؐ پر نبوّت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں اتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو جہاں یہ بات قطعی اور یقینی نظر آتی ہے کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد جملہ انبیاء و رسل کے مقصدِ بعثت سے مختلف نہیں ہو سکتا وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے مقصد میں ایک اِتمامی شان اور تکمیلی رنگ بھی ہو جس سے نبیوں اور رسُولوں کی مقدّس جماعت میں آپؐ کا منفرد مقام اور امتیازی مرتبہ واضح ہو جائے۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ از رُوئے قرآنِ حکیم بعثتِ انبیاء و رُسل کا عمومی اور اساسی مقصد کیا ہے؟ اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بحیثیتِ خاتم النبیّٖن و آخر المرسلینؐ آپ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے؟

© rasailojaraid.com

بعثتِ انبیاءؑ

کا اساسی مقصد

ایمانیات ثلاثہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلام کے اساسی معتقدات تین ہیں یعنی، توحید[1]، معاد[2] اور رسالت[3] یا ایمان باللہ[1]، ایمان بالآخرت[2] اور ایمان بالرسالت[3] لیکن عام طور پر اس پہلو پر توجہ نہیں دی جاتی کہ ان تینوں میں گہرا منطقی ربط موجود ہے اور یہ تینوں مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آیئے ذرا اختصار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان تینوں کا اصل حاصل کیا ہے اور ان کے مابین ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

ایمان باللہ

فلسفیانہ موشگافیوں اور متکلمانہ نکتہ طرازیوں سے قطع نظر ایمان باللہ کا اصل حاصل یہ ہے کہ یہ عالمِ وجود اور سلسلۂ کون و مکاں جو تا حدِ نظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا بلکہ حادث بھی ہے اور ہالک[1] و فانی[2] بھی۔ البتہ ایک ذات ایسی ہے جس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا، اسے اللہ کہہ لیا جائے یا الرحمٰن کوئی فرق واقع نہیں ہوتا[3]۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اور تمام صفاتِ کمال سے بتمام و کمال متصف ہے اور ہر اعتبار سے تنہا اور یکتا ہے نہ کوئی اس کی ذات میں

ل كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (القصص: ۸۸)

ل٢ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن: ۲۶-۲۷)

ل٣ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ج (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

.com
d.com

شریک ہے نہ صفات میں نہ حقوق میں نہ اختیارات میں[۱]!

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو "بِالْحَقِّ" اور "اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" تخلیق فرمایا ہے اور اس سلسلۂ تخلیق کا مرتبۂ کمال ہے انسان، جسے اس تعالیٰ نے اپنی صورت پر تخلیق فرمایا[۲]، پھر اس میں اپنی رُوح میں سے پھونکا اور اسے اپنی خلافت ونیابت سے سرفراز فرما دیا۔ گویا اسے ایک اعتبار سے جُملہ مراتبِ تنزّل کا حاصل بھی قرار دیا جاسکتا ہے بقول حضرتِ بیدلؒ ؎

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی

اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!

اور ایک دوسرے پہلو سے پُورے سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ عرُوج بھی!

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ (سورۃ التین)

ہم نے پیدا فرمایا انسان کو بہترین ساخت پر۔ پھر لوٹا دیا اس کو نچلوں میں سب سے نچلا!

ایمان بالآخرت کا حاصل یہ ہے کہ اس انسان کی یہ موجودہ دنیوی زندگی ہی کُل زندگی نہیں بلکہ یہ تو اس کی اصل زندگی کا حقیر سا آغاز ہے یا اس

---

[۱] (i) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۃ الاخلاص) (ii) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل: آخری آیت) (iii) وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝

(سورۃ الکہف: ۲۶)

[۲] خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ — اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا۔

اَلْحَدِیْث: شیخینؒ عن ابی ہریرہؓ

© rasailojaraid.com

.com

کی کتابِ حیات کا مختصر سا دیباچہ اور مقدمہ یا اس کے سفرِ حیات کا محض ایک آزمائشی اور امتحانی وقفہ[1] بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ | جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب | اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت فنا یا معدوم ہو جانے کا نام نہیں بلکہ صرف ایک عالم سے دوسرے عالم کو نقلِ مکانی کا نام ہے جس کی پہلی اور عارضی منزل ہے عالمِ برزخ جس کا آغاز موت کے فوراً بعد ہو جاتا ہے اور دوسری اور مستقل منزل ہے عالمِ آخرت جس کا آغاز یومِ قیامت سے ہوگا۔ بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب و کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ سب اسی ایمان بالآخرت کی تفاصیل ہیں بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم:

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْءِ سُوْءًا وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا

(ماخوذ از خطباتِ نبوی بحوالہ نہج البلاغہ)

(ترجمہ) خدا کی قسم تم سب پر موت طاری ہو کر رہے گی جیسے تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو، پھر تمہیں لازماً اٹھا لیا جائے گا جیسے تم روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہو پھر یقیناً تم سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو۔ پھر بدلہ مل کر رہے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا اور وہ یا تو جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے ہمیشہ کے لیے!

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا باہمی ربط

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت باہم

[1] خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ الملک: ۲)
پیدا کیا سلسلۂ موت و حیات تاکہ جانچے تمہیں کہ کون ہے تم میں سے سب سے اچھے عمل کرنے والا۔

d.com

مل کر مبدأ و معاد یا حیاتِ انسانی کی ابتدا و انتہا کے علم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان سے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کا تعیّن ہو جاتا ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" (ترجمہ) ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ مبدأ و معاد کے اس علم کے بغیر انسان کی حالت یا تو اس مسافر کی سی ہے جسے کسی افتاد کے باعث نہ تو یہ یاد رہے کہ اس نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا نہ یہ یاد رہے کہ اس کے سفر کی منزل کون سی ہے۔ گویا بقول فانیؔ ؎

ہم تو فانیؔ جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

یا بقول غالبؔ ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس حال میں انسان بغیر کسی منزلِ مقصود کے تعیّن کے محض بطن و فرج کے تقاضوں سے مجبور ہو کر گویا پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے زندگی بسر کر دیتا ہے۔ مطابق تمثیلِ قرآنی:

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی	بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے
وَجْھِہٖ اَھْدٰی اَمَّنْ یَّمْشِیْ	بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے
سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ	سیدھا ایک سیدھی راہ پر؟
(سورۃ الملک: ۲۲)	(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یا پھر اس کی کیفیت اُس پتنگ کی سی ہے جس کی ڈور کٹ چکی ہو اور اب وہ محض ہوا کے رحم و کرم پر ہو کر جہاں چاہے اُسے لے جائے۔ از روئے تمثیلِ قرآنی:

فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ	تو گویا وہ گر پڑا بلندی سے، پھر اچک
فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ اَوْ تَھْوِیْ	لیتے ہیں اسے (مردار خور) پرندے

© rasailojaraid.c

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (سورۃ الحج : ۳۱) یا لے جا پھینکتی ہے اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر!

اور اس ع "نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!" کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے گویا لاادریت (AGNOSTICISM) اور ارتیابیت (SCEPTICISM) کے سوا انسان کے پاس اور کچھ رہ ہی نہیں جاتا جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہستی اور وجود کے بارے میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے، گویا:

ع "رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!" [۱]

ایک اہم سوال

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کے صحیح جواب ہی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ایمان بالرّسالت کے صحیح منطقی ربط کے فہم و ادراک کا دار و مدار ہے یعنی یہ کہ انسان سے آخرت میں حساب کس بنیاد پر لیا جائے گا یا بالفاظِ دیگر محاسبۂ اُخروی کی اساسات کیا ہیں۔

مطالعۂ قرآنِ حکیم سے اس کا جو جواب سامنے آتا ہے اُسے ایک جملے میں تو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ

انسان اولاً اور اصلاً تو مسئول ہے ان استعداداتِ فطریہ یا لطائف اصلیہ کی بنیاد پر جو ہر انسان میں ودیعت کیے گئے ہیں جیسے سمع و بصر، عقل و شعور اور تفکّر و اعتبار یا لطیفۂ نفس، لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح ـــــــ اور ثانیاً اللہ تعالٰے نے انسان

---

[۱] شادؔ عظیم آبادی نے انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جسے فانیؔ بدیوانی نے اپنی منطقی انتہا تک بایں طور پہنچایا کہ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!

پر تمام حجت کا اہتمام کیا ہے بذریعہ اجرائے وحی و انزالِ کتب اور بعثت انبیاء و رسل ؑ پس ——— لیکن یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے!

لطیفہ نفس

انسان کے متذکرہ بالا لطائفِ ثلاثہ میں سے ادنیٰ ترین لطیفہ نفس ہے جس کے اعتبار سے بلاشبہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے اور جو بالکلیہ عالمِ خلق سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس کا رجحانِ اصلی عالمِ اسفل ہی کی جانب ہے اور اس کی گہرائیوں میں واقعتہً "اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ" ہی کا طوفان موجزن ہے جس کا ایک پہلو سے مشاہدہ کیا مارکس نے، دوسری جانب سے مشاہدہ کیا فرائڈ نے اور تیسری طرف سے مطالعہ کیا ایڈلر نے اور یہی ہے وجودِ انسانی کا وہ جانبِ اسفل جس کے بارے میں کچھ حقائق منکشف ہوئے ڈارون پر!

لطیفہ روح

اور بالکل دوسری انتہا پر ہے لطیفہ روح جس کی نسبت ہے خود ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب (وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ[1]) اور جس کا تعلق ہے کلیتہً عالمِ امر سے (قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ[2]) اور جس کا اصل رُخ ہے ع "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن!" کے مصداق عالمِ بالا کی جانب، چنانچہ اس میں محبتِ الٰہی کا ایک جذبہ اور لقاءِ ربّ کا ایک داعیہ ایک دھیمی آنچ والی آگ کے مانند تو ہر دم ہی سلگتا ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

البتہ کبھی کبھی اس میں ایک شعلے کی سی لپک بھی پیدا ہو جاتی ہے جسے بعض اربابِ دانش نے شعلۂ ملکوتی (DIVINE SPARK) سے تعبیر کیا ہے۔

خیر و شر کا داخلی معرکہ

گویا غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ "انسان عالمِ اصغر ہے" اور واقعتہً انسان کے باطن میں سب ہی کچھ موجود ہے چنانچہ

---

[1] سورۃ الحجر: ۲۹ - اور صٓ: ۷۲ [2] سورۂ بنی اسرائیل: ۸۵

© rasailojaraid.c

بدی کے پست ترین رجحانات بھی ہیں اور نیکی کے اعلیٰ ترین داعیات بھی۔ اور ان ہی کے مابین ایک شدید کشمکش اور مستقل جنگ جاری ہے انسان کی باطنی شخصیت کے وسیع و عریض میدانِ کارزار میں!

مسئولیّت کی اساساتِ اصلیّہ

لیکن اس معرکۂ خیر و شر میں خالقِ فطرت نے انسان کو بے یار و مددگار یا بے تیر و تفنگ نہیں جھونک دیا بلکہ اسے بہت سی استعدادات سے نواز کر اور بہت سی قوتوں سے مسلّح کر کے بھیجا ہے، چنانچہ اس کی شخصیت کا ادنیٰ ترین پہلو یعنی 'لطیفۂ نفس' بھی ایک جانب مسلّح ہے استعدادات سماعت و بصارت اور قوائے تعقّل و تفکّر سے اور دوسری جانب مسلّح ہے ایک اخلاقی حس سے جو تمیز کرتی ہے خیر اور شر میں اور پہچانتی ہے نیکی اور بدی کو۔ بنا بریں خود گواہ ہے اپنے آپ پر بصورت نفسِ لوّامہ!

بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝
(سورۃ الدھر: ۲)

ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جلے نطفہ سے تاکہ آزمائیں اسے، چنانچہ بنا دیا ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا!

۲۔ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝
(سورۃ الشمس: ۷-۸)

اور (قسم ہے) نفس کی اور جیسا کہ اسے بنایا ٹھیک ٹھیک، پھر ودیعت کر دی اس میں سوجھ بدی اور نیکی کی!

۳۔ لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ۝ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝
(سورۃ القیامۃ: ۱-۲)

نہیں! قسم ہے مجھے قیامت کے دن کی اور نہیں! بلکہ قسم کھاتا ہوں میں نفس ملامت گر کی!

.com

۴۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ o وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔ — بلکہ انسان خود ہی گواہ ہے اپنے نفس پر، خواہ پڑا بنائے بہانے!

(سورۃ القیٰمۃ: ۱۴-۱۵)

بنابریں ہر ذی نفس خود اپنی جگہ مسئول ہے اور جزا و سزا کے قابل اور اس کا مستحق یہاں تک کہ عدالت اُخروی میں ہر نفس کو اپنی جوابدہی خود ہی کرنی ہو گی اور اپنا محاسبہ خود ہی بھگتنا (FACE کرنا) ہوگا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

یَوْمَ تَاْتِیْ کُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِھَا وَتُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ۔ — جس دن آئے گا ہر نفس مدافعت کرتے ہوئے اپنی جانب سے۔ اور پورا پورا صلہ مل جائے گا ہر نفس کو اپنے کیے کا!

(سورۃ النحل: ۱۱۱)

اور نہ کوئی نفس دوسرے نفس کے کام آسکے گا، نہ اس کی جانب سے کوئی سفارش یا فدیہ قبول ہوگا، نہ اسے کسی طرف سے مدد ہی مل سکے گی۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ o — اور ڈرو اس دن سے جب نہ کام آسکے گا کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے کچھ بھی۔ اور نہ قبول کی جائے گی اس کی جانب سے کوئی سفارش، اور نہ قبول ہوگا کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہو گی!

(سورۃ البقرہ: ۴۸)

لطیفۂ قلب

اللہ نے اس پر بھی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ انسان میں ایک اور جوہر نایاب ودیعت فرما دیا جس میں معرفتِ ربانی کی شمع بھی روشن ہے اور جملہ حقائق کو بھی منعکس ہیں، ہماری مراد ہے 'لطیفۂ قلب' سے جو گویا جامِ جہاں نما ہے یا اس آئینے کے مانند جس میں عالمِ اکبر کے تمام حقائق کا انعکاس موجود ہے گویا اگر لطیفۂ نفس قوائے سمع و بصر اور

© rasailojaraid.com

تعقّل و تفکّر سے مسلح ہے جو اساس ہیں جملہ علومِ مادّی و نظری کی تو لطیفۂ قلب مسلح ہے ان قوائے تفہّم و تفقہ سے جو وجدانی طور پر ادراک کرتے ہیں لطیف تر حقائق کونیہ اور معارف لدنّیہ کا بقول شاعر

؎ بینی اندر دل علومِ انبیاء — بے کتاب و بے معید و اوستا!

اور ؎ صد کتاب و صد ورق در نار کن — رُوئے دل را جانب دلدار کُن!

اور ؎ در کنز و ہدایہ نہ تواں یافت خدا را — در آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست![1]

الغرض لطیفۂ قلب کے ودیعت کیے جانے کے بعد انسان کی مسئولیت پر آخری مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے بلفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ — یقیناً کان آنکھ اور دل ہر ایک کے

كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا — بارے میں پرسش ہو کر رہے گی!

(سورۂ بنی اسرائیل : ۳۶)

اور وہ لوگ حیوان اور چوپائے ہی نہیں ان سے بھی ارذل و اسفل قرار پاتے ہیں جو اپنی ان

---

[1] اسے محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ خود کلام نبوت میں قلب کے لیے سی قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں مثلاً اُس مشہور حدیث میں جس کی رُو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا — یہ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں بالکل ایسے جیسے

يَصْدَءُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ — لوہے پر پانی پڑنے سے زنگ آجاتا ہے!

جس پر صحابہ کرامؓ نے بالکل صحیح سوال کیا کہ:

فَمَا جِلَاءُ هَا يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ — حضور! پھر انہیں صیقل کیسے کیا جائے؟

جواباً ارشاد ہوا:

كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ — موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی

وَتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ! — کثرت کے ساتھ تلاوت!

.com

فطری استعدادات کو بے کار رکھ چھوڑیں یا قوائے فطریہ کو شل کر لیں ۔ بفحوائے آیتِ قرآنی :

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ — ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں
بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ — اور آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے
بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ — نہیں اور کان ہیں پر ان سے سُنتے نہیں
بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ — وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے
أَضَلُّ ۔ (سورۃ الاعراف : ۱۷۹) — بھی گئے گزرے !

خیر و شر کے خارجی داعیات

خیر و شر کے مابین جو داخلی معرکہ انسان کی شخصیت کے باطنی میدان کارزار میں جاری ہے، اس کو تقویت پہنچانے والے کچھ داعیات خیر و شر خارج میں بھی موجود ہیں ۔ بقول علّامہ اقبال مرحوم :

ع دنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش — تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا
اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسہ — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اصل اور فیصلہ کن اہمیّت داخلی کشاکش ہی کی ہے، خارجی داعیات محض تقویّت کے موجب ہو سکتے ہیں خواہ وہ خیر کی جانب تشویق و ترغیب پر مشتمل ہوں خواہ شر کی طرف تحریص و تحریض پر ۔ چنانچہ کسی داعی شر حتّٰی کہ ابلیس لعین و شیطانِ رجیم تک کو یہ قوّت و اختیار ہے کہ وہ کسی انسان کو بالجبر برائی پر مائل کر سکے، بفحوائے آیتِ قرآنی :

۱۔ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ — جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ
سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ — زور نہیں ۔ سوائے اس کے جس نے
مِنَ الْغَاوِينَ ۔ — خود ہی تیری پیروی کی بہکے ہوؤں
(سورۃ الحجر : ۴۲) — میں سے !

۲۔ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ — اسے (ابلیس کو) کوئی اختیار حاصل نہیں
عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ — ہے ان پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے

© rasailojaraid.c

رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ — رب پر بھروسہ کرتے ہیں!

(سورۃ النحل : ۹۹)

اور نہ ہی کسی داعیٔ خیر حتیٰ کہ سیّد الاوّلین والآخرین، خاتم النبیّین وآخر المرسلین صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جسے چاہتے ہدایت سے نواز دیتے: ازرُوئے آیت قرآنی:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ — (اے نبی!) تو راہ پر نہیں لا سکتا جسے
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ — چاہے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے

(سورۃ القصص : ۵۶) — ہدایت دیتا ہے۔

خیر اور شر کے ان خارجی داعیوں میں سے جہاں تک شر کے داعیوں کا تعلق ہے انہیں تو سب جانتے ہیں یعنی ابلیس اور اس کی صُلبی و معنوی ذرّیت انسانوں میں سے بھی اور جنوّں میں سے بھی! جن کے بارے میں قرآن میں بھی وضاحت ہے کہ:

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ — وہ (ابلیس لعین) دیکھتا ہے تم کو
مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ — اور اس کے ہم جنس بھی۔ جہاں سے

(سورۃ الاعراف : ۲۷) — تم ان کو نہیں دیکھتے!

اور حدیث نبویؐ میں بھی تصریح ہے کہ "اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ! (صحیح بخاری) یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند سرایت کر جاتا ہے" لیکن داعیانِ خیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ ملائکہ حیاتِ دنیوی کے دوران اصحابِ خیر اور اہلِ حق کے لیے تقویت و تثبیت کا ذریعہ بنتے ہیں اور جس طرح شیاطین جنّ و انس انسان کے نفسانی داعیات کی تحریک و اشتعال کا سبب بنتے ہیں اسی طرح ملائکہ انسان کی روحِ ملکوتی میں نشاط و اہتزاز کا ذریعہ بنتے ہیں اور معرکۂ حق و باطل کے دوران اہلِ حق کے قلبی سکون و اطمینان اور عملی ثبات و استقلال کا سبب بنتے ہیں۔ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

.com
d.com

۱۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔

(سورۃ الاحزاب: ۴۳)

وہی (اللہ) ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے اُجالے میں!

۲۔ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

(سورۃ الانفال: ۱۲)

جب وحی (کے ذریعے حکم) فرما رہا تھا تیرا رب فرشتوں کو کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں پس دلوں کو جمائے رکھو اہلِ ایمان کے!

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔

(سورۃ حٰمٓ السجدہ: ۳۰-۳۱)

بے شک جن لوگوں نے کہا اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر اس پر جم گئے۔ ان پر نازل ہوتے ہیں فرشتے کہ نہ خائف ہو نہ غمگین اور خوشخبری حاصل کرو اُس جنّت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے ساتھی اور مددگار دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی!

اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر

اب ہم موضوعِ زیرِ بحث کی بحثِ اوّل کے آخری نقطے تک پہنچ گئے ہیں جو یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اصل داخلی داعیاتِ خیر و شر ہیں اس کے لطائفِ نفس و رُوح، لیکن اصل حجّتِ داخلی بنتی ہیں استعداداتِ سمع و بصر و تعقّل و تفکّر اور حسِّ اخلاقی اور تفقّہِ قلبی جنہیں انسان کی مسئولیت کی اساساتِ اصلیہ کہا جا سکتا ہے، اسی طرح اصل خارجی داعیانِ خیر و شر تو ہیں علی الترتیب ملائکہ کرام اور ابلیس اور اس کی ذرّیتِ صُلبی و معنوی لیکن اس ضمن میں اتمامِ حجّت ہوتا ہے اجرائے وحی، تنزیلِ کتب

© rasailojaraid.c

بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رُسل سے جن کی حیثیت ہے حجّتِ خارجی کی اور جن کا مجموعی نام ہے ایمان بالرّسالت!

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

۱- رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (سورۃ النّساء : ۱۶۵)	(بھیجے اللہ نے) رسول بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے۔ تاکہ نہ رہے لوگوں کے پاس کوئی عذر و دلیل اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں۔ اور اللہ تو ہے ہی زبردست اور (کمال) حکمت والا!
۲- يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (سورۃ المائدہ : ۱۹)	اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آگیا ہے ہمارا رسولؐ جو واضح کر رہا ہے تم پر (ہماری ہدایت) اس کے باوجود کہ (عارضی طور پر) منقطع ہو چکا تھا سلسلہ رسالتؐ مبادا تم کہو کہ نہیں آیا ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ تو اب آگیا ہے تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور اللہ کو تو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے ہی!

گویا بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رسل کی اصل غرض و غایت ہے اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر تاکہ انسان پر اللہ کی جانب سے آخری حجّت قائم ہو جائے اور اس کے پاس اپنی غلط روی یا کج عملی کے لیے کوئی عذر اور بہانہ باقی نہ رہ جائے۔

یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے کہ جس طرح خیر و شر کے دوسرے خارجی داعیات کو انسان پر کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں بلکہ ان کی حیثیت محض ترغیب و

تحریص اور تحریک وتشویق کی ہے اسی طرح نبوّت ورسالت کی اصل نوعیت بھی دعوت وتبلیغ کی ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء ورسل کے لیے قرآن مجید میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اصطلاح مبشرین ومنذرین ہی کی ہے۔ جیسے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (سورۃ الکہف : ۵۶) اور وحی وکتاب کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال الفاظ، ذکر، ذکری' اور تذکرہ' کے ہیں۔ جیسے :۔

۱۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (سورۃ الحجر : ۹)
یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے یہ 'ذکر' (یعنی قرآن مجید) اور ہم ہی ہیں اس کے محافظ ونگہبان!

۲۔ طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ (سورۃ طٰہٰ: ۱-۲-۳)
(اے نبی) ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم مشقّت میں پڑ جاؤ بلکہ (اتارا اسے) صرف یاد دہانی کے طور پر ان کے لیے جو ڈرتے ہوں!

۳۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۔ (سورۃ عبس : ۱۱)
نہیں! یہ ایک یاد دہانی ہے!

۴۔ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (سورۃ قٓ: ۸)
سُجھانے اور یاد دلانے کو، اس بندے کے لیے جو رجوع کرے!

۵۔ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۔ (سورۃ قٓ : ۳۷)
اس میں یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس ہو دل (زندہ و بیدار) یا کان لگا کر سُنے پوری توجّہ کے ساتھ!

۶۔ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ۔
تو (اے نبی) تم یاد دہانی کرائے جاؤ۔ تمہارا کام تو بس یاد دہانی کرانا ہی ہے۔ ان

© rasailojaraid.com

پر داروغہ تو ہو نہیں (کہ ضرور ہدایت پر لے آؤ)! (سورۃ الغاشیہ: ۲۱-۲۲)

اور ان سب کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ انسان پر ایک خارجی گواہی اور شہادت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کارِ رسالت کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ جامع اصطلاح 'شہادت' کی ہے اور فریضۂ رسالت کا اصل حاصل شہادت علی النّاس ہی ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡكُمۡ رَسُوۡلًا ۙ شَاهِدًا عَلَیۡكُمۡ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ؕ

ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے پاس ایک رسُول گواہ بنا کر تم پر جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی جانب!

(سورۃ المزّمّل: ۱۸)

۲۔ لِیَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِیۡدًا عَلَیۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (سورۃ الحج: آخری آیت)

تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر ۔ اور ہو جاؤ تم گواہ پُوری نوعِ انسانی پر!

۳۔ فَكَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیۡدًا ۔

تو کیا ہو گا اس وقت جبکہ ہم بلائیں گے ہر گروہ میں سے ایک گواہ۔ اور بلائیں گے آپ کو (اے نبیؐ) بطورِ گواہ ان کے خلاف!

(سورۃ النساء: ۴۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء کی غرضِ اصلی اور ارسالِ رسل کا مقصدِ عمومی ہے انسانوں پر اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر بذریعہ تبلیغ و دعوت، تلقین و نصیحت، وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر جن کا مجموعی حاصل ہے "شہادت علی النّاس"!

چنانچہ یہی ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصدِ اوّلین۔ بفحوائے آیتِ قرآنی:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ	اے نبیؐ! ہم ہی نے بھیجا ہے تمہیں بنا
شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝	کر گواہ اور بشارت دینے والا اور
وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ	خبردار کرنے والا اور بلانے والا
سِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝	اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور روشن
(سورۃ الاحزاب : ۴۵ - ۴۶)	چراغ (ہدایت)

گویا معلّم و مبلّغ، مربّی و مزکّی مُبشّر و منذِر اور داعی و شاہد کی جملہ حیثیّتیں مشترک ہیں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلم اور جُملہ انبیاء و رُسل علیہم السّلام میں، اگرچہ ان اعتبارات سے بھی ع "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق ہر نبی اور ہر رسول کا اپنا ایک منفرد رنگ بھی ہے اور اس گلدستے میں بھی ایک امتیازی شان اور بلند و بالا مقام ہے سیّد الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا! تاہم بحیثیّت خاتم النبیّین و آخر المرسلین جن پر نبوّت و رسالت کا اختتام ہی نہیں اِتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔ آپؐ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کچھ اور ہی ہے جس کا بیان آگے آئیگا!

© rasailojaraid.com

بعثتِ محمدی

علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کی اتمامی و تکمیلی شان

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآنِ حکیم میں تین مقامات[1] پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ط

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے جبکہ پورے قرآنِ مجید میں یہ الفاظ کسی دُوسرے نبی یا رسُول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے۔

اِن الفاظِ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے اپنی مشہور تالیف "اِزَالَۃُ الخفا عن خِلافۃِ الخلفاء" میں مفصّل کلام کیا ہے اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحُوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہر نوع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اِتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے

---

[1] سورۃ التوبہ: ۳۳، سورۃ الفتح: ۲۸، اور سورۃ الصّف: ۹۔ ترجمہ: وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدٰی اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کُل دین پر۔

اِن الفاظِ مبارکہ پر غور و تدبّر لازمی ہے۔

اِن الفاظ پر توجّہ مرکوز کیجیے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا ایک[1] "الہدیٰ" اور دوسرے[2] "دینِ حق"۔

"الہدیٰ"[1]

"الہدیٰ" کو وسیع لغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہو گی لیکن نظائرِ قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعیّن کی کوشش کی جائے تو وہ ہے قرآنِ حکیم۔ اس لیے کہ وہی "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ"[1] بھی ہے اور "ھُدًی لِّلنَّاسِ"[2] بھی۔ اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ "وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا"[3] اور یہ بھی کہ "اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ"[4] اور وہی ہے کہ جسے جنّوں کے ایک گروہ نے سُنا تو فوراً پکار اُٹھے کہ "اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ"[5]

مزید برآں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں 'ارسالِ رُسُل' کے ضمن میں فرمایا کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا	ہم نے بھیجا اپنے رسُولوں کو واضح
بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ	تعلیمات اور روشن نشانیوں

---

۱ سورۃ البقرہ: آیت ۲ "ہدایت پرہیز گاروں کے لیے"

۲ سورۃ البقرہ: آیت ۱۸۵ "ہدایت پُوری نوعِ انسانی کے لیے"

۳ سورۃ الشوریٰ: آیت ۵۲ "لیکن بنا دیا ہم نے اُسے روشنی، ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعے جسے چاہیں اپنے بندوں میں سے"

۴ سورۃ بنی اسرائیل: آیت ۹ "یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے"

۵ سورۃ الجنّ: آیت ۱:۲ "ہم نے سُنا ایک قرآن بہت اچھا، جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف، تو ہم ایمان لے آئے اُس پر"

© rasailojaraid.com

الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ۔ | کے ساتھ اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور میزان۔

ظاہر ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں جس طرح "اَلۡمِیۡزَانَ" کو "دِیۡنِ الۡحَقّ" کے قائم مقام کی حیثیّت حاصل ہے اسی طرح "اَلۡکِتٰبَ" ٹھیک اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیۂ زیرِ بحث میں "اَلۡھُدٰی" کا لفظ آیا ہے۔ گویا "اَلۡھُدٰی" سے مراد بعثتِ محمدیؐ کے ضمن میں سوائے "اَلۡقُرۡاٰن" کے اور کچھ نہیں۔ (واضح رہے کہ سورۃ الحدید 'اُمُّ الۡمُسَبِّحات' کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیّت رکھتی ہے پُوری سُورۃ الصّف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیرِ بحث الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں۔)

"دِیۡنِ الۡحقّ" اسی طرح "دِینِ الحقّ" کو بھی خواہ ظاہری ترکیبِ اضافی پر محمول کر لیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے "حق کا دین" خواہ اُسے ترکیبِ توصیفی بشکلِ ترکیبِ اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے "سچّا دین" (جیسا کہ اکثر مُترجمین نے کیا ہے!) معنیٰ و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہرصورت ایک ہی ہیں یعنی "اللہ کا دین" اس لیے کہ سچّا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذاتِ حق بھی ذاتِ باری سبحانہٗ و تعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الۡحَقُّ (سورۃ الحج: ۶، ۶۲) | یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے "حق"۔ (یعنی کامل حق یا سراپا حق)

۲۔ وَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الۡحَقُّ الۡمُبِیۡنُ (سورۃ النور: ۲۵) | اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کھُلا "حق"۔

گویا "دِینِ الحقّ" بالکل مساوی و مترادف ہے "دینِ اللہ" کے! (اور عجیب بات ہے کہ قرآنِ حکیم میں تین ہی بار آیتِ زیرِ بحث کے ضمن میں دین الحقّ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے

اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ دین اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں[1]! لفظ "دین" پر توجہ[2] کو مرکوز کیجئے تو عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ "اساس القرآن" یعنی سورۂ فاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ[2] (جو لامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوگا اور بدی کا سزا کی شکل میں[3])

چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزاء وسزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:

۱۔	أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ۔ (سورۃ الماعون: ۱)	تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزا وسزا کو؟
۲۔	فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ۔ (سورۃ التین: ۷)	تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزاء وسزا کے جھٹلانے پر؟
۳۔	كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ۔ (سورۃ الانفطار: ۹)	کوئی نہیں، بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزا و سزا کو!

اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ 'یوم' کی اضافت کے

---

[1] سورۂ آل عمران: آیت ۸۳، سورۃ النور: آیت ۲، سورۃ النصر: آیت ۲۔

[2] یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت "کَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ" (جیسا کروگے ویسا بھروگے) اور دیوانِ حماسہ کے مشہور مصرعہ کے الفاظ ع دِنَّا هُمْ كَمَا دَانُوا، (ہم نے ان کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) بھی ذہن میں مستحضر کرلیں اور اسے بھی کہ عربی میں 'دَین' کہتے ہیں قرض کو جس کا لوٹایا جانا لازم ہوتا ہے۔

[3] جیساکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَ بِالسُّوْءِ سُوْءًا"! (پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا!)

© rasailojaraid.com

ساتھ یومِ قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزاء و سزا کا دن!

پھر چونکہ بدلے اور جزاء و سزا کا تصوّر لازماً متلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اُس کی اطاعت و متابعت کے تصوّر کو، لہٰذا لفظِ 'دین' نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اُٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اوّلاً 'اطاعت' کا مفہوم پیدا ہوا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں دو مرتبہ "مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْن" اور ایک بار "مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ" اور چھ مرتبہ "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْن" کے الفاظ اطاعت اور بندگی و فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں اضافہ کیا جاتا ہے "حنیفًا" یا "حُنَفَاءَ" کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآنِ حکیم کے ان الفاظِ مبارکہ کا کہ: "اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ" (سورۃ الزمر: ۳) اور "وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا" (سورۃ نحل ۵۲) —— اور بالآخر اس نے 'نظامِ اطاعت' کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی اضافتِ حقیقی تو اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظامِ زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو جیسے سورۃ یوسف میں فرمایا:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا	اس طرح ہم نے تدبیر کر دی
كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ	یوسفؑ کے لیے ورنہ بادشاہ کے
دِيْنِ الْمَلِكِ۔	قانون کی رُو سے وہ مجاز نہ تھے کہ اپنے
(سورۃ یوسف: آیت ۷۶)	بھائی کو روک سکتے۔

گویا مصر کے اس دور کے رائج الوقت نظامِ ملوکیت کو جس میں مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہ یا 'ملک' کو حاصل تھی قرآنِ حکیم "دین الملک" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ٹھیک اسی مفہوم (SENSE) میں قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں "دین اللہ" کے الفاظ سورۃ النصر میں:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝	جب آ گئی اللہ کی مدد اور فتح

.com

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ — اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سال سے زائد جدوجہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ اللہ ہی کو مطاعِ مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظامِ اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے قرآن مجید نے "دِینِ اللّٰہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ——— (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا اگر دورِ جدید کے محبوب و مقبول طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کو جس میں غلط یا صحیح بہرحال نظری طور پر[1] حاکمیت کے حامل قرار دیئے جاتے ہیں، جمہور تعبیر کیا جائے 'دِینُ الجَمْهُور' کے الفاظ سے!)

البتہ قرآنِ حکیم میں 'دین' کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافتِ مجازی قرار دیا جانا چاہیئے جیسے "دِیْنِیْ" یا "دِیْنُکُمْ" یا "دِیْنَھُمْ"۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظامِ اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا 'اُس کا دین' بن گیا۔ (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دُعا کے الفاظ میں: اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ .... الخ اسلام اصلاً تو 'دینِ اللّٰہ' ہے لیکن مجازاً 'دینِ مُحَمَّد' بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں، فِدَاہُ اٰبَآءُنَا وَاُمَّھَاتُنَا۔)

حاصلِ کلام یہ کہ "دِینُ الحقّ" سے مراد ہے "دِیْنُ اللّٰہ" یعنی وہ نظامِ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کُلّی و مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو اور یہ دراصل خاتم النبیّین و آخر المرسلین

---

[1] بقول علامہ اقبال مرحوم ؂

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

© rasailojaraid.com

صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا شدہ اتمامی و تکمیلی صورت ہے اس "اَلْمِیْزَان" کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر قدرے مختلف صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو عَلٰی نَبِیِّنَا وَ عَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ! ــــــــــ اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے۔ "تاکہ لوگ قائم رہیں اس نظامِ قسط پر"[1]۔

آخری بعثت کے لیے وقت کی تعین و انتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختمِ نبوت اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمتِ الٰہی کارفرما ہے اس کے جانب بھی انہی دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے کہ بعثتِ محمدی عَلٰی صَاحِبِھَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کا زمانہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسلِ انسانی گویا عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی؛

۱۔ ایک اس اعتبار سے کہ عقلِ انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ نسلِ انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور جنہوں نے مذاہبِ عالم، فلسفہ، تصوف اور علمِ کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا، گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیحؑ تک کا عرصہ فکرِ انسانی کے عہدِ طفولیت سے نکل کر عقل و شعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہبِ عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتبِ فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرور ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے

---

[1] "لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ" (سورۃ الحدید: ۲۵)

لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعۃً نیا مذہب وجود میں آیا ہے نہ حقیقۃً جدید مکتبِ فکر یا مدرسۂ فلسفہ۔ اور فلسفۂ جدید کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتبِ فکر سامنے آئے ہیں اُن کی حیثیّت نئی بوتلوں میں پُرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں ——— اب اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں و مناسب تھی اس کے لیے کہ ع "نوعِ انساں را پیامِ آخریں" یعنی قرآن حکیم "الھدٰی" بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اُس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا کہ نوعِ انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ:

۱۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (سورۃ الاسراء: ۹) — یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔

۲۔ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ (سورۃ الاسراء: ۱۰۵) — اور اس قرآن کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا۔ اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا۔

۳۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (سورۃ الاسراء: ۸۸) — کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جنّ اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں۔

اور اُس نے پوری نوعِ انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا — اور اگر ہو تم شک میں اس

© rasailojaraid

نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ (سورۃ البقرہ : ۲۳)

کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورت!

افسوس کہ تاحال قرآن حکیم کے وجوہ اعجاز میں سے اصل توجّہ صرف اُس کے ادبی ولغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیّت، تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گرد گھومتی رہی ہے ———— اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجہ ہوئی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں بایں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بٹھایا گیا اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اُس کے قدموں میں ڈال دی گئیں درآں حالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناپختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اصلاً "اَلْهُدٰى" ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی 'فکری و عملی رہنمائی' ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکر انسانی بطورِ خود (AS SUCH) اپنی آخری بلندیوں کو چھو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے 'بالغ' ہو گیا تھا!

۲۔ آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دُوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا اور انسان کی ہیئت اجتماعیہ بھی ارتقاء کے جُملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عرُوج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انسان اوّلاً قبائلی زندگی اور اُس کے بعد شہری ریاستوں (CITY STATES) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دَور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیاتِ انسانی پر نظامِ اجتماعی کی گرفت پُوری شدّت کو پہنچ چکی تھی، اور انسان کو تمدّن و اجتماعیت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ مزید برآں اب اُس دور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں

فرد بمقابلہ جماعت، مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری بے اعتدالیوں کے طفیل عالمِ انسانیّت کو موت و حیات کی شدید کشمکش اور TO BE OR NOT TO BE کی سی اذیت بخش کیفیّت سے دوچار ہوناتھا ــــ لہٰذا یہی موزوں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی عطا کر دیا جائے جو واقعتہً "اَلْمِیْزَان" کے حکم میں ہو اور تمدّن و اجتماعیّت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہِ وسط کا تعین کر دے اور معاشرت، معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سواءُ السّبیل کو پوری طرح واضح کر دے تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی (SOCIAL PERVERSION) کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال (ECONOMIC EXPLOITATION) کا اور نہ سیاسی جبر (POLITICAL REPRESSION) کا۔ اور ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیش نظر تھا یعنی "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" وہ نبی آخر الزّمان صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیلِ دینِ حق کے ذریعے ابدالآباد تک کے لیے پورا ہو جائے، بمصداقِ آیتِ قرآنی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج کے دن میں نے کامل کر دیا
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ	تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر
رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ	دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا میں
(سورۃ المائدہ: ۳)	نے تمہارے لیے دین اسلام کو۔

لِیُظْہِرَہٗ

اب ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور 'لِیُظْہِرَہٗ' پر غور فرمایئے۔ تو بحمد اللہ یہاں 'اظہار' کے معنی تو متفق علیہ ہیں یعنی 'غالب کر دینا'، البتّہ یہاں فعلِ اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد رائیں موجود ہیں اگرچہ ان سے مُراد و معنیٰ میں کوئی حقیقی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں فعلِ اظہار کا فاعل بھی وہی ہے جو فعل ارسال کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور دوسری

(حاشیہ اگلے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

رائے یہ ہے کہ 'لِیُظْهِرَهٗ' میں ضمیرِ فاعلی رسول کی جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصُول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب موجود ہو تو دُور جانا صحیح نہیں اِلّا آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو، سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود عالمِ واقعہ میں قرآنِ حکیم کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں۔ اور انہی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہارِ دینِ حق کے لیے عالمِ واقعہ میں بالفعل سعی و جہد اور شدید محنت و مشقّت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کی اگرچہ فاعلِ حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے بفحوائے آیتِ قرآنی :

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	تو انہیں (کفّارِ قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ
قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ	اللہ نے کیا اور (اے نبیؐ) جب تم نے اُن پر
رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى	خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی تھی (وہ مُشتِ خاک)
(سورۃ الانفال : ۱۷)	بلکہ اللہ نے پھینکی تھی !

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور کمزور سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پُورے تصوّر ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعمِ خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضۂ اظہارِ دینِ حق ہی سے بَری ہو بیٹھے ہیں وہ غور کرتے کہ غزوۂ بدر کے بعد جب آیتِ متذکرہ

حاشیہ صفحہ گذشتہ

۱؎ 'ظَهر' کہتے ہیں پیٹھ کو ——— اور ظاهر استعارۃً غالب کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسے قرآن مجید میں سورۃ الصف کے آخر میں " فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ " (پس وہی ہوئے غالب!) اس لیے کہ جو کسی کی پیٹھ پر سوار ہو وہ یقیناً اس پر قابو یافتہ ہے اور غلبہ رکھتا ہے' اور عیاں کے معنی میں بھی اس لیے کہ راکب مرکب کی نسبت لازماً نمایاں تر ہوتا ہے ! 'اِظْهَار' بابِ افعال سے مصدر ہے اور اس میں فعلِ متعدی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ظاہر کر دینا یا غالب کر دینا۔

.com

بالا نازل ہوئی اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سعی وجہد سے دستکش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رُخ بہتا ہے اور آیا اس صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولتِ ایمان اور نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا ہے غور کرنا چاہیے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آ گئے ہے اور صورتحال وہ تو نہیں جو "خوئے بدرا بہانہ لبسیار !" کی کہاوت میں بیان ہوتی یا جگر مراد آبادی کے اس شعر میں کہ:-

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں   دامن پکڑے چھاؤں گھنیری !

اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف جن میں آیت زیرِ بحث وارد ہوئی ہے تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں، خصوصاً سورۃ الصّف تو از اوّل تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ اور اس میں اس آیۂ مبارکہ یعنی: هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ کے فوراً بعد مسلمانوں کے جذبۂ جہاد و قتال کو للکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں ہے اور پھر صاف صاف سنا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کٹھن اور پرصعوبت وادیوں سے ہو کر گزرتی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ	اے اہلِ ایمان ! کیا میں رہنمائی
اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ	کروں تمہاری ایسے کاروبار کی جانب
مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ	جو چھٹکارا دلا دے تمہیں دردناک عذاب
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ	سے ہے ایمان (محکم) رکھو اللہ تعؐ پر اور اس کے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ	رسولؐ پر اور جہاد کرو اسی کی راہ میں اور

© rasailojaraid.com

وَاَنۡفُسِکُمۡ (سورۃ الصّف : ۱۰-۱۱) کھپاؤ اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی۔

اگر اس راہ کو اختیار کرتے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنّت کا بھی، اُخروی فوز و فلاح کا وعدہ بھی ہے اور دنیا میں تائید اور فتح و نصرت کا بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نصرتِ خدا و رسولؐ کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبوبیتِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی ——— بصورتِ دیگر یہ مقاماتِ بلند تو خارج از بحث ہیں ہی عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا بھی اُمیّدِ موہوم کے سوا کچھ نہیں!

گویا بات بالکل سیدھی ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا اصلاً فرضِ منصبی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعویدار ہوں اُن کے خلوص اخلاص کا اصل امتحان (TEST) یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسول دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کرلیں تو کامیاب و کامران ہیں ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد!!

چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرمادی:

وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ اور تاکہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے
وَرُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اُس کی اور اس کے رسولوں کی غیب کے باوجود

اور سورۃ الصّف کا اختتام بھی ہوا اس آیۂ مبارکہ پر!

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡۤا اے اہل ایمان! بنو مددگار اللہ کے
اَنۡصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیۡسَی جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے
ابۡنُ مَرۡیَمَ لِلۡحَوَارِیّٖنَ مَنۡ حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار
اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اللہ کی طرف!

اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کی مرضی۔

لِیُظۡہِرَہٗ کی ضمیرِ مفعولی کے بارے میں بھی دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ اس کا مرجع

.com

ہے دین الحق اور دوسری یہ کہ یہ راجع ہے رسولؐ کے جانب ——— اگرچہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اس لیے کہ رسول کے غلبے کا مطلب بھی اُن کی ذات یا اُن کے کنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دینِ حق ہی کا غلبہ ہے۔

علی الدّینِ کُلِّہٖ

"علی الدّین کُلِّہٖ" کا ترجمہ اکثر وبیشتر مترجمین نے "تمام ادیان پر" کیا ہے۔ گویا "الدّین" کے لام تعریف کو لام استغراق قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہاں جسقدر امکان لام استغراق کا ہے اتنا ہی لام جنس کا بھی ہے، چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "سب دین پر" یا "سارے دین پر" یا "کل دین پر" یا "پورے جنس دین پر" بھی کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کے اوّلین اردو مترجمین امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جلیل القدر صاحبزادے شاہ رفیع الدّینؒ اور شاہ عبد القادرؒ ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کے ترجمے میں رعایتِ لفظی زیادہ ملحوظ ہے اور مؤخر الذکر کا ترجمہ بامحاورہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعد کے اکثر وبیشتر مترجمین اصلاً ان دو بھائیوں ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے تو اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں صاف اعلان کیا ہے کہ اصلاً وہ شاہ عبد القادرؒ ہی کا ترجمہ ہے جس میں ایک صدی بیت جانے کے باعث اردو کے محاورے میں جو تبدیلی آگئی ہے صرف اس کے پیش نظر لفظی تبدیلی کی گئی ہے۔

شاہ عبد القادرؒ نے "علی الدّین کلِّہٖ" کا ترجمہ سورۃ التّوبہ اور سورۃ الفتح میں تو "ہر دین سے" کے الفاظ سے کیا ہے اور سورۃ الصّف میں "دینوں سے" سب سے" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جبکہ شاہ رفیع الدینؒ نے صرف سورۃ التّوبہ میں "اوپر دین سب کے" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، اور سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف دونوں مقامات پر "اوپر دین سارے کے" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

© rasailojaraid.c

گویا جہاں تک ٹھیٹھ عربی قواعد کا تعلق ہے یہ دونوں ترجمے مساوی طور پر صحیح اور درست ہیں، البتہ اگر حسبِ ذیل حقائق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح تر اور موزوں تر ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ ہی کا ہے:

۱- پورے قرآن مجید میں نہ کہیں 'ادیان' کا لفظ استعمال ہوا ہے، نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں "الدین" کا ترجمہ "تمام ادیان" کرنا ممکن ہو۔

۲- تفسیر قرآن کے اہم اصول "القرآن یفسّر بعضہ بعضاً" کے پیشِ نظر اس معاملے میں یہ حقیقت تو انتہائی فیصلہ کُن اہمیّت کی حامل ہے کہ "الدّین" کے ساتھ "کُلّہ" کا تاکیدی کلمہ ان تین آیات کے علاوہ پورے قرآن میں صرف حسبِ ذیل آیہ مبارکہ میں وارد ہوا ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ	کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل
(سورۃ الانفال: ۳۹)	کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔

اور یہاں ظاہر ہے کہ "سارے ادیان" کا ترجمہ قطعاً ممکن نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی "پورے کا پورا دین" یا "سارے کا سارا دین" اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنیٰ ہی نہیں ہیں جب کہ سارے کے سارے دین یا پورے کے پورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے۔ (جیسا کہ اس سے قبل "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" اور "اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ" اور "وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا" کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔)

اب "الدّین" کے اصطلاحی معنی ذہن میں مستحضر کر کے "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کا ترجمہ کیجیے تو وہ یوں ہو گا:

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الهدٰے (یعنی قرآنِ حکیم) اور دینِ حق (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کُلّی کے اصول پر مبنی نظامِ زندگی

(یعنی اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے وہ (یعنی رسولؐ) اُسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پُورے کے پُورے دین (یعنی نظامِ اطاعت یا نظامِ زندگی) پر"!

اس آیۂ مبارکہ کے مفہوم و معنی کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے یہ 'اِظْھَارُ دِیْنِ الْحَقِّ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ' کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لیا جانا چاہیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ 'اظہارِ دینِ حق'، دو وجوہات کی بنا پر لازمی و لابدی تھا:

۱۔ ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار ہی سے غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظامِ اطاعت بے معنیٰ ہے جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سا فرق و تفاوُت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جزوی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گذارہ کر سکتا ہے۔ جس طرح غلبۂ اسلام کے زمانے میں عیسائیّت، یہودیّت اور مجوسیّت یا بدھ مت اور ہندو مت ایسے مذاہب "یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ"[1] کی کیفیّت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبۂ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ رہا[2] —— جب کہ دین ایک کُلّی حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریّت اور ملوکیّت یا کیپیٹلزم اور کمیونزم کسی خطۂ زمین پر بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے اسی طرح دو دین بھی کسی

---

[1] البراءۃ: ۲۹۔ "دیتے ہوئے جزیہ اپنے ہاتھ سے 'چھوٹے' ہو کر!"

[2] جس کی صحیح ترین تصویر ہے علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

© rasailojaraid.com

جگہ ہم سر اور ہم پلّہ ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور ان کے مابین مفاہمت (DETENTE) یا پُر امن بقائے باہمی (PEACEFUL CO-EXISTENCE) کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا سمٹ اور سکڑ کر مذہب کی حیثیت اختیار کر لے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی ہو جائے[2]!

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں دو حقیقتیں اور بھی پیشِ نظر رہنی چاہئیں: ایک[1] یہ کہ لفظ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیثِ نبویؐ کے پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکر کے لیے۔ جیسے مذہبِ حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی، مذہب حنبلی اور مذہب اہل حدیث جن کی حیثیت دینِ اسلام کے اصل شجرۂ ثابتہ کی فروع اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے[2] یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے جیسے شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے تاہم از حضرت آدمؑ تا آنحضورؐ جملہ انبیاء و رُسل کا دین ایک ہی تھا بفحوائے آیاتِ قرآنی:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا	مقرر کیا اُس (اللہ) نے تمہارے لیے (اے مسلمانو)
وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ	دین کے طور پر وہی جس کی وصیت کی تھی اُس نے

---

[1] بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!! (اقبال)

[2] اس اعتبار سے غور کیا جائے تو سورۃ التوبہ کی محولہ بالا آیت کے الفاظ "وَهُمْ صَاغِرُوْنَ" کا مفہوم پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتا ہے!

اِلَیۡکَ وَمَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَمُوۡسٰی وَعِیۡسٰۤی ۔ (سورۃ الشوریٰ : آیت ۱۳)	نوحؑ کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبیؐ) تمہاری طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (علیہم السّلام) کو۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'اظہار دین الحق علی الدّین کلہٖ' اس لیے بھی ضروری تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظامِ اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کرکے اور عملاً چلا کے نہ دکھا دیا جائے بس ایک خیالی جنّت (UTOPIA) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور رسالتِ محمدیؐ کی جانب سے نوعِ انسانی پر "شہادت" اور "اتمامِ حُجّت اور قطعِ عُذر" (جو سلسلۂ رسالت کی غرضِ اصلی ہے!) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ آپؐ اس دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کرکے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپؐ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل محنت و مشقّت اور پیہم سعی و جُہد سے 'غلبۂ دینِ حق' کی صورت میں وہ 'نظامِ عدلِ اجتماعی' بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا۔ جو بعد میں خلافتِ راشدہ کے دَوران بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھل کر پھول بنتی ہے اور اس کے دَوران نوعِ انسانی کے سامنے یہ 'معجزات' عملاً رونما ہو جاتے کہ "انسانی حرّیت' اخوّت اور مساوات" صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کا رُوپ بھی دھار سکتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ نظامِ عائلی میں مرد کی قوّامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزّت اور باوقار مقام دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نظامِ سیاسی میں کامل آزادیٔ رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے جُملہ تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نظامِ معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیّت اور ذاتی مفاد کے جذبۂ محرّکہ کو برقرار رکھتے ہوئے بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے ——

(حاشیہ اگلے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

تو اُس دور کے انسان پر دینِ حق کی جانب سے "اتمام حجت" کیسے ہو سکتا جس کے فاتح ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم! اور کیسے واضح ہو سکتی یہ حقیقت کہ انسان نظامِ اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (GOOD) یا قدر (VALUE) کا بھی تصور کر سکے وہ اسے بتمام و کمال اور بلغایت توازن و اعتدال موجود پائے اس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بالکل یہ محسوس ہو کہ نظامِ عدلِ اجتماعی کے ضمن میں نوعِ انسانی کی ساری ذہنی تگ و دو اور عملی بھاگ دوڑ گویا نظامِ محمدی تک رسائی کی سعی و کوشش ہے، بقول علامہ اقبال: ؎

حاشیہ صفحہ گذشتہ

۱ ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G. WELLS) کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بغض و عداوت ہے وہ اُن رکیک حملوں سے ظاہر ہے جو اُس نے آنحضورؐ کی ذاتی اور خصوصاً عائلی زندگی پر کیے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی تالیف (A CONCISE HISTORY OF THE WORLD) میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ "انسانی حریت اخوت اور مساوات کے وعظ تو اگرچہ دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے۔ چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی اُن کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن نوعِ انسانی کی تاریخ میں پہلی بار ان اصولوں پر مبنی نظام عملاً قائم کر کے دکھا دیا محمد نے" (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ روشن ترین مثال ہے عربی زبان کی ایک کہاوت کی کہ "الفضل ما شهدت به الأعداء" (اصل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور پائے)

۲ چنانچہ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے جو چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا کہ جب ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو یہاں کا ایک ہندو مہاتما (گاندھی) مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم قوم و ہم مذہب لوگوں سے کہے کہ تمہارے سامنے نمونے کے طور پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا دورِ حکومت رہنا چاہیے (نہ کہ رامائن اور مہابھارت یا بکرماجیت یا چندر گپت موریا کا!)۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے رسالے "ہریجن" میں ۱۹۳۷ء میں اس وقت لکھے تھے جب برطانوی ہند میں پہلی بار صوبائی وزارتیں بنی تھیں اور چونکہ مسلم لیگ نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات کا مقاطعہ کیا تھا لہٰذا پورے ہندوستان میں کانگرس ہی نے وزارتیں بنائی تھیں!

d.com

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو　　آنکہ از خاکش بروید آرزُو!
یاز نورِ مصطفیٰ او را بہاست　　یا ہنُوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دین اور ختم و اکمالِ نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپ انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پر مستزاد تنظیم، ہجرت، جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے باطل نظامِ زندگی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اُس کی جگہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظامِ اطاعتِ خداوندی کو پورے نظامِ اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپ کے مقصدِ بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار سے آپ انبیاء و رُسل کی پوری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

داعئ انقلاب

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھی داعئ انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ کی تحقیر و توہین ہے لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ 'داعئ انقلاب' کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بتمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ ہیں! اس لیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب جزوی تھے اور اُن سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رُونما ہوئی جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاسی اور ہیئتِ حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اُس سے پُوری انسانی زندگی

© rasailojaraid.com

میں تبدیلی رُونما ہوئی اور عقائد و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدّن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

انقلابی جدّوجُہد

رہی آپؐ کی انقلابی جدوجہد تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پُوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کشمکش اور تصادُم کے جُملہ مراحل اور ہجرت و جہاد و قتال کی تمام منازل سے گذار کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ اور یہ نہایت محیّرُ العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپؐ نے ایک فردِ واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس (اور وہ بھی قمری!) کی مختصر سی مدّت میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کو بالفعل غالب و نافذ فرما دیا۔ فصلّی اللہ علیہ وسلم وفداہ اٰباءنا واُمّھاتنا!

نبویؐ طریقِ کار

رہا یہ سوال کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے رُونما ہوئی اور انقلابِ محمدیؐ کا منہاجِ اساسی کیا ہے، اور آپؐ کی انقلابی جدّوجہد کن مراحل سے گذری ہے تو یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر کسی اور صحبت میں گفتگو ہوگی!

سرِدست موضوعِ زیرِ بحث کی مناسبت سے دو مزید اُمُور کی نشاندہی مطلوب ہے:

۱۔ مغربی مفکّرین کی ناسمجھی

ایک یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے اسی اتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث سخت ٹھوکریں کھائی ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ کے فہم میں مغربی مفکّرین یا مُستشرِقین نے۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیاء و رُسل کی اساسی غرض و غایت تو ہے، چنانچہ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلّغ بھی، معلّم بھی

id.com

ہوتے ہیں اور مربّی و مزکّی بھی، بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی، واعظ بھی ہوتے ہیں اور ناصح بھی، ریفارمر (REFORMER) بھی ہوتے ہیں اور مُصلح بھی لیکن چونکہ اُن پر ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں لہٰذا یہ بات اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ علَم بھی، سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور مدبّر و سیاستدان بھی۔ چنانچہ جب وہ آنحضورؐ کی شخصیّتِ مبارکہ میں یہ جُملہ کمالات پہلو بہ پہلو دیکھتے ہیں تو سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں چنانچہ اُن میں سے کوئی تو آپؐ کو نبی یا رسول ماننے سے ہی صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپؐ کی عظمت صرف بطورِ انسان تسلیم کر کے رہ جاتا ہے[1]، کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ "محمدؐ بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے البتہ بحیثیتِ مُدبّر و سیاستدان کامیاب ہو گئے[2]"، اور کوئی آپؐ کی شخصیّت کو دو مستقل حصوں میں منقسم کر بیٹھتا ہے، چنانچہ اُسے "مکّے والا محمدؐ" اور نظر آتا ہے اور "مدینے والا" اور[3]۔ فَلَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْجَاھِلِیْنَ!

---

[1] جیسے پروفیسر منٹگمری واٹ کے الفاظ:

ONE OF THE GREATEST SONS OF ADAM

یا جیسے ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے الفاظ:

THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMELY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS

[2] جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا:

MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN

[3] جو وہم پیدا کرنا چاہا ہے پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضورؐ کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف کر کے ایک

MOHAMMAD AT MECCA

اور دوسری

MOHAMMAD AT MEDINA

© rasailojaraid.

۲۔ اُمّت کا فرضِ منصبی

اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تکمیل جملہ اعتبارات سے بتمام وکمال ہو چکی ہے یا وہ کسی پہلو یا اعتبار سے ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے اور اگر بات دوسری ہے اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ؎

"وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے — نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!"

تو کیا اُمّت صرف عید میلاد النبیؐ منا کر، یا جلسے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق و شوق کے ساتھ درود و سلام بھیج کر اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے اور صورتِ حال واقعۃً یہ ہے کہ ؎

"وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!"

تاہم ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک — اِک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

کے مصداق گذارش ہے ——— کہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ختمِ نبوّت و رسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء و رُسل کیا کرتے تھے آپؐ کے بعد اب وہ سب کے سب آپؐ کی اُمّت کے ذمّے ہیں۔ گویا خواہ دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر، تعلیم و تربیّت اور اصلاح و تزکیہ پر مشتمل فریضۂ شہادتِ حق ہو جو بعثتِ انبیاء و رُسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اساسی ہے خواہ اعلاءِ کلمۃِ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ حق علی الدّین کُلّہٖ پر مشتمل بعثتِ محمّدیؐ کا مقصدِ امتیازی اور منتہائے خصوصی ہو، جملہ اہلِ ارض اور جمیع کُرّۂ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو آنحضورؐ کے نام لیوا ہیں اور آپؐ کے نامِ نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپؐ کی اُمّت میں ہونے کو موجبِ سعادت جانتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا

id.com

لہٰذا آپؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، ایک اپنے زمانے کے اہلِ عرب کی جانب اور دوسری تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب چنانچہ سورۃ الجمعہ میں بھی فرمایا گیا کہ آپؐ "امیین" کے لیے بھی مبعوث ہوئے اور "آخرین" کے لیے بھی اور آغازِ کلام میں آنحضورؐ کے جس خطبے سے اقتباس دیا گیا تھا اس بھی آپؐ نے فرمایا:

اِنِّی لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ	میں یقیناً اللہ کا فرستادہ
خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ	ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری
کَافَّۃً ط	نوعِ انسانی کی جانب بالعموم!

ان میں سے "بعثتِ اولیٰ" کے جملہ فرائض "شہادت علی النّاس" اور "اظہارِ دینِ حق علی الدّین کُلِّہٖ" دونوں کے اعتبار سے آپؐ نے بنفسِ نفیس ادا فرما دیئے خواہ اس میں مخالفت ہوئی یا مزاحمت، تمسخر ہوا یا استہزاء، ذہنی کوفت کا سامنا ہوا یا جسمانی اذیّت کا، مصیبتیں آئیں یا مشکلات، محنت کرنی پڑی یا مشقّت، پھر خواہ شعب بنی ہاشم کا دَور آیا یا یومِ طائف، اور ہجرت کا مرحلہ آیا یا جہاد کا۔ خواہ غارِ ثور میں چھپنے کی نوبت آئی یا سراقہ ابنِ مالک کے تعاقب کی، اور بدر کا معرکہ پیش آیا یا اُحد کا۔ اور خواہ مصعبؓ بن عمیر کی بے گور و کفن لاش سامنے آئی یا حمزہؓ ابن عبدالمطلب کا اعضاء بُریدہ لاشہ، خواہ خندق کا مرحلہ آیا یا حُنَین کا اور خواہ خیبر کی مہم سر کرنی پڑی یا تبوک کی، آپ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی اور ؎

"یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید!"

کے مصداق آپؐ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے!

حتّٰی کہ تیئیس برس کی محنتِ شاقّہ کے نتیجے میں حق کا بول واقعتہً بالا ہو گیا، کلمۂ حق بالفعل سب سے بلند ہو گیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کا پرچم فی الواقع لہرانے لگا تا آنکہ حجّۃ الوداع کے موقع پر جمیع اطراف و اکنافِ عرب سے آتے ہوئے کم از کم تعداد کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایات کے مطابق سوا لاکھ افراد کے اجتماع سے

© rasailojaraid.com

"اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ"[1] کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ: نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ"[2] آپؐ چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیقِ اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

آپؐ کے بعد آپؐ کی بعثتِ عامہ کی جملہ ذمہ داریاں اُمّت کے کاندھوں پر آگئیں بفحوائے آیتِ قرآنی: لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو آپؐ کے حقیقی جانشین تھے خلافت راشدہ کے دَوران جو واقعۃً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی، آپؐ کی جانب سے تبلیغِ دین' 'شہادت عَلَی النّاس' 'اقامتِ دین' اور 'اظہارِ دینِ حق عَلَی الدِّین کُلّہٖ' کے فرائض ادا کیے اور تیس سال کی قلیل سی مدّت میں اللہ کے دین کا پرچم اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے پر لہرا دیا۔

اور اس کے بعد شروع ہوا زوال و انحطاط کا وہ عمل جو مسلسل تیرہ صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دینِ حق جو پُورے رُوئے ارضی پر غالب ہونے کے لیے نازل ہوا تھا "غریبُ الغُربا" بن کر رہ گیا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالؔی مرحوم ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے — اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریبُ الغُربا ہے!

اور

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اسلام کا گِر کر نہ اُبھرنا دیکھے!

---

[1] "میں نے (آپ لوگوں تک پیغامِ الٰہی) پہنچا دیا یا نہیں؟"

[2] "ہم گواہ ہیں کہ آپ نے تبلیغ بھی فرما دی امانت بھی ادا فرما دی اور (ہماری) خیر خواہی کا حق بھی ادا فرما دیا"

id.com